Fikr-o-Nasar (Islamabad) 42:1 (2004)

تعارف و تبصرہ کتب

کتاب : دارالمصنفین کی تاریخی خدمات

مؤلف : محمد الیاس اعظمی

ناشر : خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری - پٹنہ

سال اشاعت : ۲۰۰۲ء

صفحات : ۱۲ + ۳۸۴

قیمت : ۹ ڈالر (بیرون ہندوستان)

تبصرہ نگار : ڈاکٹر سفیر اختر ☆

دارالمصنفین-اعظم گڑھ گزشتہ ۹۰ برس سے علمی وفکری خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کی خدمات بجاطور پر جامعاتی تحقیق کا موضوع ہیں۔ ڈاکٹر خورشید نعمانی نے اس کی ادبی خدمات کو اجاگر کیا ہے (''دارالمصنفین کی ادبی خدمات''، بمبئی: رحیمی پریس، ۱۹۷۷ء)، اور اب اس کی پیش کردہ تاریخی و سوانحی کاوشوں کے تعارف و تبصرہ اور جائزہ و تجزیہ کو جناب محمد الیاس اعظمی نے بطور موضوع چنا ہے۔ یہ ثانی الذکر جائزہ جناب مؤلف کے ''ابتدائیے'' اور ناشر کے ''حرفِ آغاز'' کے علاوہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب- ''اردو میں تاریخ نگاری کی روایت'' - میں ۷۵-۱۷۷۴ء میں لکھی گئی اولیں اُردو تاریخی کتاب ''قصہ و احوالِ روہیلہ''(۱) سے لے کر علامہ شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء) کے نوبر شیریں ''المامون'' (اشاعت: ۱۸۸۷ء) تک، اُردو میں ایک صدی سے کچھ زائد عرصے کی تاریخ نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ابتدائی انفرادی کاوشوں کے بعد فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ - ۱۸۵۴ء)، دہلی کالج اور اس کی ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی (تاسیس ۱۸۷۲ء) اور سائنٹفک سوسائٹی (تاسیس ۱۸۶۲ء) کی کاوشوں کے ساتھ مختلف تاریخ نگاروں اور بالخصوص سرسید احمد خان کی تاریخی نگارشات کا تعارف لکھا گیا ہے۔ دوسرے باب - ''علامہ شبلی کے تاریخی کارنامے'' - میں علامہ شبلی نعمانی کی تاریخ نگاری کے

☆ چیف ایڈیٹر، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

DMHL

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

مقاصد، یورپی اہل قلم کے بارے میں ان کے رویے، ان کے تصورِ تاریخ، اُن کی تاریخی تالیفات و مقالات (''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم''، ''المامون''، ''الفاروق''، ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر''، ''سیرۃالنبی، جلد اول اور جلد دوم''، ''تراجم''، ''کتب خانۂ اسکندریہ''، ''اسلامی حکومتیں اور شفاخانے''، ''ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر''، ''الجزیہ''، ''حقوق الذمیین''، ''ہمایوں نامہ''، ''مآثر رحیمی''، ''جہانگیر اور تزکِ جہانگیری'')، اور ان کی مؤرخانہ شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرے، چوتھے اور پانچویں ابواب میں بالترتیب مولانا سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء)، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی (م ۱۹۷۴ء) اور سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن (م ۱۹۸۷ء) کے، جو یکے بعد دیگرے دارالمصنفین کے سربراہ رہے، مختصر حالاتِ زندگی اور ان کی کاوشوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں دیگر تاریخ نگار رفقائے دارالمصنفین - مولانا عبدالسلام ندوی (م ۱۹۵۶ء)، سید ابوظفر ندوی (م ۱۹۵۸ء)، مولانا ابوالحسنات ندوی (م ۱۹۲۴ء)، حاجی معین الدین ندوی (م ۱۹۴۱ء)، مولانا سعید انصاری (م ۱۹۶۲ء)، سید نجیب اشرف ندوی (م ۱۹۶۸ء)، سید ریاست علی ندوی (م ۱۹۷۶ء)، ڈاکٹر محمد عزیر، مولانا عبدالسلام قدوائی (م ۱۹۷۹ء)، مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی دریابادی- کی کاوشوں کا مختصر اور جامع تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ساتویں باب میں دارالمصنفین کے تاریخی کارناموں کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں سیرۃالنبیؐ، سیرالصحابہؓ، تابعین و تبع تابعین، نامورانِ اسلام، تاریخ اسلام اور تاریخ ہند کے سلسلہ ہائے تالیفات، نیز ماہنامہ ''معارف'' (اجراء: ۱۹۱۶ء) میں شائع شدہ درجنوں تاریخی مقالات کے ذکر کے ساتھ یہ نتیجہ نکالا گیا ہے: ''دارالمصنفین کے تمام تاریخی کارناموں کے تفصیلی مطالعہ و جائزہ سے یہ صاف طور سے ثابت ہوتا ہے کہ دارالمصنفین نے تاریخ کی جس قدر خدمت انجام دی، برصغیر میں کسی ایک ادارہ کی جانب سے اس کی اور کوئی مثال نہیں ملتی، اور اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو شاید عالم اسلام کا کوئی علمی وتحقیقی ادارہ اس کی مثال نہ پیش کر سکے'' (ص ۳۶۲)۔

جناب محمد الیاس اعظمی کو دبستانِ شبلی اور دارالمصنفین سے بجا طور پر محبت ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اردو خواں طبقے میں مطالعۂ تاریخ کا ذوق پیدا کرنے، نیز مسلم تاریخ کے بارے میں عمومی غلط فہمیوں کو دُور کرنے میں رفقائے دارالمصنفین کی تحریروں نے جہاں بنیادی کردار ادا کیا ہے، وہیں انھوں نے تاریخ اسلام کے بعض ادوار اور موضوعات پر اولیں وقیع کاوشیں پیش کی ہیں۔ ''سیرۃالنبیؐ'' دارالمصنفین کی مطبوعات میں سرفہرست ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے جب اس کی داغ بیل ڈالی تھی تو ان

کے پیش نظر ایک ایسی کتاب کا ہیولیٰ تھا جس کی توقع صدیوں میں ہوتی ہے، اور جو صدیوں تک زندہ رہتی ہے۔ اسے علامہ شبلی نعمانی کی ''بلند نظری'' بھی سمجھا جا سکتا ہے، مگر کم از کم ایک صدی گزر جانے، متعدد ان متون کے شائع ہو جانے جو علامہ شبلی کو دستیاب نہ تھے، اور ''سیرۃ النبیؐ'' کو ہر زاویے اور ہر آئینے سے جانچنے کے باوجود اس کی اہمیت ختم نہیں ہوئی۔ ''سیرۃ النبیؐ'' کے مقدمے میں علامہ شبلی نے اپنے پیش نظر منصوبے کی تفصیل یوں دی ہے:

> اس کتاب کے پانچ حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں عرب کے مختصر حالات، کعبہ کی تاریخ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لے کر وفات تک عام حالات اور واقعات غزوات ہیں۔ اسی حصہ کے دوسرے باب میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی اخلاق و عادات کی تفصیل ہے۔ آل و اولاد اور ازواجِ مطہرات کے حالات بھی اسی باب میں ہیں۔
>
> دوسرا حصہ منصب نبوت سے متعلق ہے۔ نبوت کا فرض تعلیمِ عقائد، اوامر و نواہی، اصلاح اعمال اور اخلاق ہے۔ اس بناء پر منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے۔ اس حصہ میں فرائض خمسہ اور تمام اوامر و نواہی کی ابتداء اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے۔ اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں، نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لیے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا، اور کیوں کر وہ تمام عالم کے لیے اور ہر زمانہ کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔
>
> تیسرے حصہ میں قرآن مجید کی تاریخ، وجوہِ اعجاز اور حقائق و اسرار سے بحث ہے۔
>
> چوتھے حصہ میں معجزات کی تفصیل ہے۔ قدیم سیرت کی کتابوں میں معجزات کا الگ باب باندھتے ہیں، لیکن آج کل تو اس کو بالکل مستقل حیثیت سے لکھنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ معجزات کے ساتھ اصل معجزہ کی حقیقت اور امکان سے بحث کرنے کی ضرورت پیش آ گئی ہے، البتہ جن معجزات کی تاریخ اور سنہ متعین ہے، مثلاً معراج یا تکثیرِ طعام وغیرہ، ان کو اس سنہ کے واقعات میں لکھ دیا ہے۔
>
> پانچواں حصہ خاص یورپین تصنیفات کے متعلق ہے، یعنی یورپ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مذہب اسلام کے متعلق کیا لکھا ہے؟ ان کا سرمایۂ معلومات کیا ہے؟ تاریخی

واقعات میں وہ کیوں کر غلطیاں کرتے ہیں؟ مسائل اسلام کے سمجھنے میں ان سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں؟ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات یا مسائل اسلام پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں، ان کے جوابات۔(۲)

علامہ شبلیؒ نے اپنی علمی معاونت کے لیے جن باصلاحیت اہلِ علم کو یک جا کیا تھا، ان میں مولانا سید سلیمان ندویؒ بھی شامل تھے۔ سید صاحب نے ''سیرۃ النبیؐ'' کے موعودہ پہلے حصے کے لیے جب عربوں کی ذیلی تقسیم، ان کے شہروں اور آبادیوں پر معلومات کی چھان پھٹک شروع کی تو وہ پھیل کر ''ارض القرآن'' (اشاعت: ۱۹۱۵ء) کی شکل اختیار کر گئی، جو اپنے موضوع پر تاحال منفرد کتاب ہے۔ جب سید صاحب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا تو عرب دنیا میں اثریات نے اتنی ترقی نہ کی تھی، اور اس خطے میں جو بعدازاں سعودی عرب قرار پایا، اثری تحقیقات کے لیے سرے سے کوئی کوشش ہی نہ ہوئی تھی، مگر آج صورتِ حال بہت بدل گئی ہے، اثری تحقیقات کے نتیجے میں نئی معلومات سامنے آ گئی ہیں اور وہ موضوع جس پر سید صاحب نے پہلی اینٹ رکھی تھی، کسی باہمت صاحبِ علم کو دعوت دے رہا ہے۔

سید صاحب نے اپنے مرحوم استاد کے ''منصوبۂ سیرت'' میں رنگ بھرنے کے لیے چار مکمل جلدیں اور ایک زیرِ تسوید جلد یادگار چھوڑی ہے۔ ان جلدوں میں دلائل و معجزات، خصائص نبوت، عقائد و عبادات، اخلاق اور معاملات پر تعلیمات نبوی کی روشنی میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ بعض اہل قلم نے (جن میں سے ایک دو نمائندہ بزرگوں کا جناب محمد الیاس اعظمی نے نام لے کر ذکر کیا ہے) سید صاحب کی مؤخرالذکر کاوشوں کو سیرت کے موضوع سے الگ قرار دیا ہے۔ اگرچہ جناب اعظمی نے ان کے اعتراض کو مسترد کر دیا ہے، مگر پس منظر کے اختلاف کے ساتھ اسے سرے سے مسترد کرنا بھی چنداں درست نہیں، اسلاف میں سے بعض بزرگوں، مثلاً علامہ ابن قیمؒ (م ۱۳۵۰ء) نے ''زادالمعادالی ھدی خیرالعباد'' میں تعلیمات نبوی کو سیرت سے جدا نہیں کیا، مگر بیسویں صدی کے تصورِ سیرت میں اس قدر پھیلی ہوئی تعلیمات کو سیرت کا جزو بھی نہیں سمجھا گیا۔

سیرت نبویؐ کے موضوع پر سید صاحب کے ''خطبات مدراس'' تو خاصے کی چیز ہیں، اور ''رحمتِ عالم''، کم تعلیم یافتہ بڑوں کے لیے لکھی گئی ابتدائی کاوش ہے۔ دارالمصنفین کے علمی کاموں میں علامہ شبلی نعمانیؒ کی تحریروں کی اشاعت کو نمایاں مقام حاصل ہے، اور ان کی نوک پلک سنوارنے میں سید صاحب اور ان کے ساتھیوں نے بہت محنت کی ہے، مگر یہ کام اصلاً ہے دارالمصنفین کی تاسیس

(۱۹۱۶ء) سے پہلے کا، اس لیے اسے نظرانداز کرتے ہوئے سید صاحب، ان کے ساتھیوں اور ان کے جانشینوں کا کام ہی دراصل دارالمصنفین کا کارنامہ ہے۔ ''عرب و ہند کے تعلقات'' اور ''عربوں کی جہاز رانی'' پر اردو اور انگریزی میں، آج بہت کچھ دستیاب ہے، تاہم یہ وہ موضوعات ہیں جن پر برصغیر میں سید صاحب نے ہی بطور متقدم قلم اٹھایا تھا، بعد میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے پندرہویں صدی عیسوی تک کے معروف عرب سیّاحوں، جغرافیہ نویسوں اور مؤرخین کی تالیفات سے ان حصوں کو اردو میں ''ہندوستان: عربوں کی نظر میں'' (اشاعت: حصہ اول، ۱۹۵۹ء، حصہ دوم، ۱۹۶۲ء) کے نام سے منتقل کر دیا، یوں اصلاحی صاحب نے ان مآخذ تک تاریخ برصغیر کے طلبہ کی رسائی آسان کر دی، جن پر سید صاحب نے ''عرب و ہند کے تعلقات'' کی بنیاد رکھی تھی۔ سید صاحب کی تالیف ''عربوں کی جہازرانی'' کی دوسری اشاعت (۱۹۵۸ء) میں ڈاکٹر محمد حمیداللہ کا ''استدراک'' شامل کیا گیا ہے، اور اس کتاب کو سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے انگریزی میں The Arab Navigation کے نام سے منتقل کیا ہے، تاہم دارالمصنفین کے اہلِ قلم کو اس کتاب کی نئی اشاعت کے لیے، مغربی اہل علم کی گزشتہ ستر اسی برس میں سامنے آنے والی نگارشات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔

سید صاحب کی تالیفات میں ''سیرتِ عائشہؓ'' بھی ایک بے مثال کتاب ہے جو اہل علم سے تحقیق و تخریج کے ساتھ اچھے ایڈیشن کا تقاضا کرتی ہے۔

سید صاحب کے بعد دارالمصنفین میں تحقیق و تدقیق کے حوالے سے سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے نئی راہیں تلاش کیں، اور برصغیر کی مسلم تاریخ پر اس طرح نظر ڈالی کہ یہ محض جنگ و جدل کی تاریخ نہیں، بلکہ اس میں فکر و دانش، تہذیب و معاشرت اور علوم و فنون کی ترقیاں بھی شامل ہیں۔ ان کی تالیفات - ''بزم تیموریہ''، ''بزم مملوکیہ''، ''بزم صوفیہ''، ''ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک جھلک''، ''ہندوستان: امیر خسرو کی نظر میں'' وغیرہ - سے یہی پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی، حاجی معین الدین احمد ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا سعید انصاری وغیرہ نے صحابہ کرامؓ، تابعین، نامورانِ اسلام اور عرب دنیا میں مسلمانوں کی ریاست و سیاست کو موضوع تحقیق بناتے ہوئے ایسی متعدد کتابیں پیش کیں جن سے اُردو کا دامن مالا مال ہوا۔ ان بزرگوں کے سامنے عامۃالمسلمین رہے ہیں، لہٰذا اُن کے ہاں دقتِ نظر کا وہ معیار نہیں جو سید صاحب یا ان کے استاد علامہ شبلیؒ کے پیشِ نظر تھا۔

جناب محمد الیاس اعظمی نے دارالمصنفین کے قلم کاروں کے مطالعۂ تاریخ کو ''بطور کارنامہ'' پیش کیا ہے، جس کا ایک حصہ واقعتاً کارنامہ کہلانے کا مصداق ہے، (مندرجہ بالا سطروں میں بھی اس جانب اشارے کیے گئے ہیں) مگر بعض موضوعات ایسے بھی ہیں جن پر دوسرے معاصر اداروں اور افراد نے بھی قلم اٹھایا ہے، اورجہاں بعض پہلوؤں سے دارالمصنفین کا پلہ بھاری ہے، وہیں کمزوریاں بھی موجود ہیں، چوں کہ جناب اعظمی نے دارالمصنفین کی خدمات کو اجاگر کرنے تک اپنی مساعی کو محدود رکھا ہے، اور بیسویں صدی میں عالمی سطح پر، یا برصغیر ہی کی سطح پر مسلم تاریخ نگاری کا تقابلی مطالعہ نہیں کیا، اس لیے اگر یہ پہلو سامنے نہیں آ سکا، تو چنداں قابلِ گرفت بھی نہیں، تاہم ہماری خواہش ہے کہ عہد حاضر کے مسلم مؤرخین تنقیدی نظر کے ساتھ اپنے اسلاف کی تاریخ نگاری کو دیکھتے ہوئے جہاں اس سے روشنی حاصل کریں، وہیں اس میں موجود خلا پُر کریں اور اسلاف کے کارناموں کی تکمیل (اور حسبِ ضرورت تصحیح) بھی کریں، اور اس سلسلے میں ہماری توقعات جناب اعظمی سے بھی وابستہ ہیں۔

''دارالمصنفین کی تاریخی خدمات'' کی ورق گردانی سے جہاں ہماری معلومات میں اضافہ ہوا ہے، وہیں دورانِ مطالعہ میں محسوس ہوا کہ بعض جزوی معلومات درست نہیں، یا سہوِقلم کے نتیجے میں کتاب میں غلطیاں در آئی ہیں۔ اس توقع کے ساتھ کہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گا، ان تسامحات کی نشان دہی کی جاتی ہے:

☆ کتاب کے اولیں باب ''اردو میں تاریخ نگاری کی روایت'' کے لیے جناب مؤلف نے، اولاً ثانوی مآخذ سے معلومات اخذ کی ہیں، ، ثانیاً اس باب میں شامل مباحث پر جدید تحقیقات ان کی نظر سے نہیں گزر سکیں۔ مثال کے طور پر دہلی کالج کی تاریخی خدمات کے سلسلے میں انہوں نے بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی تالیف ''مرحوم دہلی کالج'' (اشاعت دوم: ۱۹۴۵ء) اور خواجہ احمد فاروقی کے مرتبہ ''دلّی کالج میگزین'' کے ''قدیم کالج نمبر'' (تالیف: ۱۹۵۳ء) سے استفادہ کیا ہے، مگر بنارس ہندو یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لیے پیش کیا گیا جناب سمیع اللہ کا مقالہ ''انیسویں صدی میں اُردو کے تصنیفی ادارے'' (فیض آباد: اکتوبر ۱۹۸۸ء) اُن کے پیشِ نظر نہیں رہا۔

جناب مؤلف نے دہلی کالج کے مترجمین کی ترجمہ کردہ گیارہ تاریخی کتابوں کے بارے میں کچھ بنیادی معلومات جمع کی ہیں، اور ان دس مزید کتابوں کے محض نام لکھنے پر اکتفاء کیا ہے، ''جن کی [انہیں] تفصیلات دستیاب نہ ہوسکیں'' (ص ۲۶)۔ اول الذکر گیارہ کتابوں میں انہوں نے منشی پیارے

لال آشوب (م ۱۹۱۴ء) کی کتابیں ''دربارِ قیصری'' اور ''قصصِ ہند'' بھی شامل کی ہیں۔ بلاشبہ آشوب دہلی کالج سے وابستہ رہے تھے، مگر مذکورہ بالا دونوں کتابیں اس دور کی یادگار ہیں جب وہ دہلی کالج سے الگ ہو کر ۱۸۶۹ء میں لاہور آ گئے تھے۔

☆ جناب مؤلف نے انیسویں صدی کے ان مؤرخین کی کاوشوں کا ذکر کیا ہے جو کسی ادارے سے وابستہ نہ تھے، البتہ اپنے ذاتی ذوقِ تاریخ نگاری کے تحت انہوں نے اردو کے خزانے میں تاریخی ادب کا اضافہ کیا تھا۔''اودھ کے تاریخ نگار'' (لکھنؤ: دانش محل، ۱۹۹۱ء) کی سند پر انہوں نے مولوی خیرالدین محمد الہ آبادی کی تالیف ''عبرت نامہ'' اور سید غلام علی نقوی کی تاریخ ''عمادالسعادت'' کو اردو کتابوں کے طور پر پیش کرتے ہوئے اُن کا تعارف لکھا ہے (ص ۳۰)۔

''عبرت نامہ'' اور ''عمادالسعادت'' دونوں کتابیں فارسی میں لکھی گئی تھیں(۳)، اورثانی الذکر پہلی بار۱۸۶۴ء میں طبع ہوئی تھی۔ ''عبرت نامہ'' کے بارے میں اطلاع دی گئی ہے کہ یہ''۱۸۰۶ء میں مکمل ہوئی''، مگر سی - اے- سٹوری کے بیان کے مطابق اس میں ۱۷۹۱ء تک کے حالات کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح ''عمادالسعادت'' کے ضمن میں سید غلام علی نقوی کی دوسری کتاب ''نگارنامۂ ہندی'' کا تذکرہ کیا گیا ہے (ص ۳۰)، وہ بھی اردو میں نہیں، بلکہ فارسی میں تالیف ہوئی تھی(۴)۔

اسی طرح آگرہ کے آثار پر لکھی گئی دو کتابوں ''تفریح العمارات'' اور''احوال شہرا کبر آباد'' کو جناب مؤلف نے شریف حسین قاسمی کے ''مقدمۂ سیر المنازل'' (دہلی : غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۳ء) کے حوالے سے اُردو کتابوں میں شمار کیا ہے، مگر یہ دونوں بھی فارسی تالیفات ہیں(۵)۔

☆ ۱۸۵۷ء کے انقلاب اور اس کی تاریخ کے حوالے سے لکھا گیا ہے: ''اس جدوجہد آزادی کے متعلق اردو میں متعدد کتابیں لکھی گئیں، مثلاً فضل حق خیرآبادی کی 'باغی ہندوستان' اور پنڈت سندرلال کی کتاب 'سن ستاون' وغیرہ ---'' (ص ۳۴)۔ واضح رہے کہ مولانا فضل حق خیرآبادی (م۱۸۶۱ء) نے اپنی یادداشتیں عربی زبان میں لکھی تھیں جنہیں کوئی نام نہ دیا تھا۔ مولوی عبدالشاہد خان شروانی نے جب انہیں اردو میں منتقل کیا، اور مولانا فضل حق خیرآبادی کی سوانح حیات کے ساتھ مرتب کیا تو ان یادداشتوں سمیت کتاب کو''الثورۃالہندیہ - باغی ہندوستان'' کا نام دیا تھا(۶)۔

سرسید احمد خان کی تاریخ نگاری کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے ''گبن کی کتاب 'زوال سلطنت روم' اور ایلیٹ کی 'تاریخ ہند' اور بعض دوسرے مؤرخین کی کتابوں کا ترجمہ کرا کے شائع کیا'' (ص ۳۸)۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرسید احمد خان نے گبن کی کتاب کا ترجمہ کرایا تھا، جو

علامہ شبلی نعمانیؒ کے بھی زیر مطالعہ رہا، مگر کیا یہ ترجمہ کبھی اشاعت پذیر ہوا تھا؟ اگر یہ شائع ہوا ہے، تو اسے انیسویں صدی کی تاریخی کتب میں مذکور ہونا چاہیے تھا، یہی کیفیت ایلیٹ کے 'تاریخ ہند' کے ترجمے کی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض مصنفین، مثلاً گاڈفرے ہگنز کی تالیف ''اپالوجی فار محمدؐ'' کا ترجمہ سرسید احمد خان کے ایماء پر مولانا محمد احسن نانوتوی (م ۱۸۹۴ء) نے ''حمایت الاسلام'' کے نام سے کیا تھا، اور اس کی اشاعت کے جملہ مصارف سرسید نے خود برداشت کیے تھے۔ اگر جناب مؤلف اس اجمال کو ذرا کھول کر بیان کر دیتے تو مفید رہتا۔

☆ انیسویں صدی میں جن اداروں نے اردو تاریخ نگاری کو فروغ دیا، ان میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ، مرحوم دہلی کالج اور سائنٹفک سوسائٹی - علی گڑھ کے ساتھ پنجاب بک ڈپو - لاہور اور پنجاب یونیورسٹی کی خدمات بھی اہم ہیں، مگر آخرالذکر دونوں اداروں کی کتب کا تذکرہ نہیں ہو سکا۔

☆ سائنٹفک سوسائٹی - علی گڑھ کی ''چند تاریخی مطبوعات'' میں ''تزکِ جہانگیری'' اور ''دیباچہ تاریخ فیروز شاہی'' کو شامل کیا گیا ہے (ص ۴۴)۔ ڈاکٹر سمیع اللہ کی تحقیق و تفحص کے مطابق سائنٹفک سوسائٹی نے صرف پندرہ کتابیں شائع کی تھیں، جن میں نہ ''تزکِ جہانگیری'' شامل ہے اور نہ ''دیباچہ تاریخ فیروز شاہی'' ہی (۷)۔

☆ کتاب کے دوسرے باب میں ''الفاروق'' کے انگریزی تراجم کے حوالے سے لکھا گیا ہے:

> انگریزی میں اس کے دو ترجمے ہوئے، پہلا ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے کیا جسے شیخ محمد اشرف تاجر کتب اسلامیہ- لاہور نے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا۔ بعد میں اسے عماد پبلی کیشن - دہلی نے شائع کیا۔ دوسرا ترجمہ محمد سلیم نے کیا جسے شیخ محمد اشرف ہی نے لاہور سے شائع کیا۔ اب تک اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں (ص ۱۱۱)۔

اس اطلاع کا مأخذ جناب محمد ضیاء الدین انصاری کا مرتبہ اشاریہ- ''جہانِ شبلی'' - ہے(۸)۔

حقیقت یہ ہے کہ ''الفاروق'' کا صرف ایک ہی کامل ترجمہ ہے جس کا حصہ اول مولانا ظفرعلی خان کی کاوش کا نتیجہ ہے، اور اس کے ناشر شیخ محمد اشرف نے ''الفاروق'' کے ترجمے کی تکمیل کے لیے دوسرے حصے کا ترجمہ محمد سلیم سے کرایا۔

☆ سید ابوظفر ندوی کی تالیفات کے ضمن میں ان کی ایک کتاب ''تاریخ بوہرہ'' کے بارے میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے حوالے سے لکھا گیا ہے:

> احمد آباد اور جونا گڑھ کے زمانۂ قیام میں مولانا ابوظفر ندوی کو بوہروں کی تاریخ سے بڑی

دلچسپی پیدا ہوئی، چنانچہ بوہروں کے بعض اکابر کی فرمائش پر اس فرقہ کی ایک تاریخ لکھی، لیکن جب وہ شائع ہوئی تو بعض حلقوں میں اس کے چند مشمولات پر اعتراض ہوا جس کی وجہ سے اس کی اشاعت روک دی گئی (ص ۳۱۵)۔

کیا ''تاریخ بوہرہ'' کے نام سے سید ابو ظفر ندوی کی کوئی کتاب شائع ہوئی تھی یا نہیں؟ جناب اعظمی نے سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی بیان کردہ روایت سے نام اخذ کیا ہے، تاہم سید ابوظفر ندوی کی ایک کتاب ''عقدالجواہر فی تاریخ البواہر'' (تواریخِ داؤدی بوہرہ) (کراچی: بہ سعی و اہتمام معز میاں بی- اے اجینی ایڈووکیٹ، س - ن) کتب خانوں میں دستیاب ہے۔

☆ سید ابو ظفر ندوی کی تالیفات کے ضمن میں لکھا گیا ہے کہ ''انہوں نے تاریخ سندھ، مختصر تاریخ ہند اور تاریخ خاندان غزنہ جیسی معرکۃ الآراء کتابیں لکھیں'' (ص ۳۱۲)، مگر جس ''تاریخ خاندانِ غزنہ'' کو معرکۃ الآراء کتابوں میں شامل کیا گیا ہے، وہ ضائع ہو چکی ہے۔ اس کے بارے میں خود مصنف کی رائے ہے کہ یہ کتاب ''شائع نہ ہو سکی۔ اب ہم صرف اس کے نام سے واقف ہیں'' (ص۳۱۷)۔

☆ حاجی معین الدین ندوی کی تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے اطلاع دی گئی ہے: ''دائرۃ المعارف حیدر آباد نے بھی ان کی خدمات مستعار لیں، وہاں انہوں نے قدیم ہندوستانی تاریخی مقامات کا ایک جغرافیہ عربی زبان میں مرتب کیا جسے دائرۃالمعارف نے شائع کیا'' (ص ۳۲۲)۔ اس مجمل اطلاع کی حقیقت یہ ہے کہ دائرۃالمعارف العثمانیہ - حیدر آباد مولانا سید عبدالحی رائے بریلوی (م۱۹۲۳ء) کی تالیف ''نزہۃالخواطر'' شائع کر رہا تھا، اس میں مذکور اماکن کے تعارف کے لیے حاجی صاحب نے ایک مختصر ''معجم الامکنہ'' مرتب کی تھی جو سید سلیمان ندوی کی تقدیم کے ساتھ دائرۃالمعارف العثمانیہ نے شائع کی تھی۔

☆ ''طبقات الامم'' کو ''مشہور ادیب اختر جونا گڑھی کی کتاب'' بتایا گیا ہے (ص ۳۵۹)۔ کتاب کے مصنف ابن صاعد اندلسی ہیں، اور احمد میاں اختر جونا گڑھی (م۱۹۵۵ء) اس کے مترجم ہیں۔

☆ ''عرب و ہند کے تعلقات'' (تالیف سید سلیمان ندوی) کے دو انگریزی ترجموں کی اطلاع دی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ ایک ترجمہ جو جناب سعید الحق دسنوی نے کیا تھا، پہلے سہ ماہی ''اسلامک کلچر'' (حیدر آباد) میں قسط وار شائع ہوا، اور ''بعد میں اسے حکومت پاکستان نے کتابی صورت میں شائع کیا'' (ص ۱۹۸)۔ اس آخرالذکر اطلاع کا ماخذ کیا ہے؟ اور یہ ترجمہ کب شائع ہوا تھا؟ یہاں

جملہ اطلاعات دینا ضروری تھا۔

☆ صفحات ۳۶۰ - ۳۶۱ پر دارالمصنفین کے ''سلسلۂ ناموران اسلام'' کے تحت کتابوں کا نام بہ نام ذکر کرنے کے بعد لکھا گیا ہے: ''ان تمام کتابوں کی قدروقیمت کا جائزہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے'' (ص ۳۶۱)، مگر ان میں سے ''امام رازی'' (تالیف عبدالسلام ندوی)، ''حکمائے اسلام'' (عبدالسلام ندوی)، اور ''ابن رشد'' (مولانا محمد یونس فرنگی محلی) وغیرہ کا کوئی جائزہ کتاب میں شامل نہیں۔

دورانِ مطالعہ میں بعض افراد، شہروں اور کتابوں کے نام سہو قلم یا حروف چین (compositor) کی غفلت کی وجہ سے صحیح طور پر نہیں لکھے جا سکے۔ مثال کے طور پر مارش مین (حاشیہ، ص ۲۶)، ریورنڈریکسوس (ص ۴۴)، ابن صاعد (ص ۶۳)، گاڈفری ہگنز (ص ۷۳)، محمد رضا کحالہ (ص ۱۱۱)، الفنسٹن (ص ۱۳۳)، اصحاب الرس (ص ۱۹۷)، سیرافی (ص ۱۹۹)، ابن حوقل (ص ۱۹۹)، ابن خردازبہ (ص ۱۹۹)، واسکوڈی گاما (ص ۲۰۰)، افتخار عالم مارہروی (ص ۲۲۶)، کشن پرشاد (ص ۲۳۹)، الفریڈ گیوم (ص ۳۵۳)، اور ابن ابی اصیبعہ (ص ۳۴۹) کے نام درست ہونا چاہییں۔ بعض مغربی اہل قلم کے نام اردو کے ساتھ ساتھ قوسین میں لاطینی رسم الخط میں درج کیے گئے ہیں جن میں سے پامر (Palmer، ص ۶۶)، ایڈورڈ سخاؤ (E. Sachau، ص ۶۶، ۷۹)، نولڈکے (Theodore Noldeke، ص ۶۶، ۷۱)، مارگولیتھ (Margoliouth، ص ۶۶)، ٹی - ڈبلیو - آرنلڈ (T. W. Arnold، ص ۴۸)، اور رانکے (Ranke، ص ۸۸) وغیرہ کے لاطینی حروف میں ناموں کے ہجے درست نہیں۔ شہروں کے ناموں میں ٹھٹھہ (ص ۲۹)، اور کتابوں میں سے ''خریدۃالقصر'' (ص ۲۲۲) اور 'رفع الملام عن ائمۃالاسلام' (ص ۲۳۴) صحیح طور پر درج نہیں ہو سکے۔

علامہ شبلی کے سفرِ روم و مصر و شام کا سال ۱۹۸۲ء درج ہو گیا ہے (ص ۱۰۹)، اور دریافت امریکہ کا سال ۱۳۹۸ء کتابت ہوا ہے (ص ۲۱۰) جو صحیح نہیں، اور صفحات ۷۶ - ۷۷ پر ''مقالاتِ شبلی'' کا حوالہ دیتے ہوئے متعلقہ جلد کا اندراج ہونے سے رہ گیا ہے۔

حواشی

۱- ڈاکٹر جمیل جالبی کی تالیف ''تاریخ ادب اُردو، جلد دوم'' (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، س - ن)، پر انحصار کرتے ہوئے مؤلف نے لکھا ہے کہ ''قصہ و احوالِ روہیلہ'' کی تالیف ۱۷۷۴ - ۱۷۸۱ء کے درمیان ہے، مگر

قاضی عارف حسین کے مطابق، جنہوں نے اس کتاب کے خطی نسخے (مخزونہ انجمن ترقی اُردو پاکستان - کراچی) کا عکس ''تاریخ کی پہلی کتاب: قصہ و احوال روہیلہ'' (واہ کینٹ: مجلس تصنیف و تالیف پاکستان، ۱۹۸۹ء) کے نام سے شائع کیا ہے، ''قرائن اور داخلی شواہد کی بناء'' پر ''قصہ و احوال روہیلہ'' کا سالِ تالیف ۱۱۸۸ھ [۷۵-۱۷۷۴ء] قرار پاتا ہے (ص ۱۰)۔

۲- شبلی نعمانی، ''سیرۃ النبی''، حصہ اول، اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۹۶۲ء، صفحات ۱۰۱ - ۱۰۳۔ یہ اقتباس جناب محمد الیاس اعظمی نے بھی نقل کیا ہے (صفحات ۱۴۳ - ۱۴۴)، مگر پڑھتے ہوئے گنجلک محسوس ہوا تو اصل کتاب دیکھنے پر اس کے ناقص ہونے کی تصدیق ہو گئی۔ واللہ اعلم اُن کے زیرِاستعمال نسخۂ ''سیرۃ النبی'' ہی غلط چھپا ہے، یا نقل کرنے میں توجہ مرکوز نہیں رکھی جا سکی۔

۳- مولوی خیرالدین محمد الہ آبادی (م قریب بہ ۱۸۲۷ء) کے لیے دیکھیے: سی - اے- سٹوری، Persian Literature: A Bio-bibliographical Survey، جلد ۱، حصہ ۱، لندن: لوزک اینڈ کمپنی، ۱۹۷۰ء، صفحات ۵۲۰ - ۵۲۲، ۶۴۱ - ۶۴۲۔ سید غلام علی نقوی کے لیے دیکھیے: حوالہ مذکورہ، صفحات ۷۰۵ - ۷۰۶

۴- حوالہ مذکورہ، ص ۳۹۹

۵- حوالہ مذکورہ، صفحات ۶۹۲-۶۹۳

۶- اشاعت اول، بجنور: مدینہ پریس، ۱۹۴۷ء؛ اشاعت دوم، (با اضافہ ''حرفِ آغاز و تتمہ'' محمد عبدالحکیم شرف قادری، ''تحشیہ'' حکیم محمد موسیٰ امرتسری)، لاہور: مکتبہ قادریہ ۱۹۷۴ء؛ اشاعت سوم، لاہور: مکتبہ قادریہ، ۱۹۷۸ء؛ اشاعت چہارم، (بہ تجدید نظر، عبدالشاہد خان شروانی)، محمد آباد گوہنہ (اعظم گڑھ): المجمع الاسلامی فیض العلوم ۱۹۸۵ء

۷- سمیع اللہ، ''انیسویں صدی میں اردو کے تصنیفی ادارے''، فیض آباد: مؤلف، ۱۹۸۸ء، صفحات ۳۳۲ - ۳۳۳

۸- مشمولہ ''فکر ونظر'' (علی گڑھ)، شبلی نمبر، جون ۱۹۹۶ء، صفحات ۳۱۵ - ۳۹۱

جناب محمد الیاس اعظمی نے اپنی ایک دوسری تحریر ''الفاروق کے تراجم'' (مشمولہ ''محمد یٰسین مظہر صدیقی، عبیداللہ فہد، ''الفاروق - ایک مطالعہ''، علی گڑھ: ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، مارچ ۲۰۰۲ء، صفحات ۳۲۹ - ۳۳۳) میں مزید معلومات کے ساتھ اس کے انگریزی تراجم کے بارے میں اپنی تحقیق ان الفاظ میں پیش کی ہے:

> ''الفاروق'' شائع ہوئی تو اسے انگریزی میں منتقل کرنے کی کئی لوگوں نے کوشش کی، سب سے پہلے ۱۸۹۹ء میں علامہ شبلی کے شاگرد مولانا ظفر علی خان نے شمس العلماء مولانا سید علی بلگرامی اور مولوی عزیز مرزا کی تحریک پر اس کام کا آغاز کیا اور ''الفاروق'' کے ایک حصہ کا ترجمہ کیا جسے ۱۹۳۹ء میں شیخ محمد اشرف تاجر کتب اسلامیہ کشمیری بازار لاہور نے شائع کیا۔ ---''الفاروق'' کا انگریزی ترجمہ شیخ عطاء اللہ صاحب لاہور نے بھی شروع کیا تھا، مگر وہ اسے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے، البتہ دوسرا انگریزی ترجمہ جناب محمد سلیم کے قلم سے نکلا۔ یہ ترجمہ بھی شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور ہی نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔--- (ص ۳۳۲)۔

جناب اعظمی کی اس تحریر میں صحیح لکھا گیا ہے کہ مولانا ظفر علی خان نے 'الفاروق' کے صرف پہلے حصے کا ترجمہ کیا تھا، مگر محمد سلیم کے ترجمے کو ''الفاروق'' کا دوسرا ترجمہ ہی قرار دیا گیا ہے۔